مقالات

اساسِ دین کی تعمیر

(۳)

از جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

ماحول کا جائزہ اگر آپ اس اصول کو سامنے رکھ کر "خدا کے نزدیک وہی ایمان بالآخرت قابل پذیرائی ہے جو اپنی پشت پر حسنِ عمل اور پابندیٔ شرع کی مضبوط شہادتیں رکھتا ہو"، اپنے ماحول کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ایک تلخ اور روح شکن صورتِ حال نظر آئے گی اور آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ قرآن کی جن آیات میں یہودیوں کی بدعملیوں اور آخرت فراموشیوں کی روداد مذکور ہے وہ کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کے حال پر بھی چسپاں ہو رہی ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ امتِ محمدیہ بحیثیت مجموعی آخرت فراموشی کے اسی مقام پر پہنچ گئی ہے، جہاں قوم یہود پہنچی تھی مگر یہ کہنے سے ہم اپنے کو کیونکر باز رکھیں کہ اس کی اکثریت اپنے عمل میں کم و بیش انہی صفات کا اظہار کر رہی ہے جن پر بنی اسرائیل گرفتارِ غضبِ الٰہی ہوئے تھے۔ انفرادی طرزِ زندگی میں، اجتماعی معاملات میں، معاشرتی تعلقات میں، معاشی کاروبار میں، گھر میں، بازار میں، حتیٰ کہ مدرسہ اور خانقاہ تک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور برابر ہوتا رہتا ہے اس کی تہ میں اب فکرِ فردا اور اندیشۂ آخرت کا اگر کھوج لگائیے تو معلوم ہوگا کہ اب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس فکر اور اس اندیشے سے اپنے دلوں کو گویا خالی ہی کر لیا ہے۔ یہ جو کام بھی کرنے اٹھتے ہیں اس کے دنیوی فوائد اور مصالح سوچنے میں تو اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیتے ہیں مگر شاید فکرِ آخرت کی ایک معمولی خلش بھی ان کے دماغ میں پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اور جن لوگوں نے ابھی اس فکر کو اپنے دماغوں سے بالکل خارج نہیں کیا ہے ان میں سے بھی اکثر اس بھروسے پر غلط کام کرتے ہیں کہ "سَيُغْفَرُ لَنَا" اور "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً"۔ ان کا خیال یہ ہے کہ

ہم خواہ کچھ کریں، بہر حال جب ہم مسلمان گھر میں پیدا ہو چکے ہیں تو اب اللہ میاں مجبور ہیں کہ ہمیں بخش دیں، چاہے بلاحساب بخشیں یا چند دنوں کی معمولی گوشمالی کے بعد۔ ان دونوں گروہوں کو اگر الگ کر دیجیے تو صرف ایک قلیل ترین حصہ ایسے لوگوں کا بچتا ہے جو اس فکر آخرت کو اپنے ذہنوں میں وہی جگہ دیتے ہیں جو دینا چاہیے اور جس کو قرآن کا مطلوبہ ایمان بالآخرت کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ حصہ اتنا قلیل التعداد ہے اور مسلمانوں کی پھیلی ہوئی آبادی میں اتنا منتشر ہے، اور مزید برآں اجتماعی اصلاح کے لیے منظم جہاد کرنے سے بھی اس قدر غافل یا کوتاہ ہے کہ اس شرذمۂ قلیلہ کی موجودگی کا کوئی اثر مسلمانوں کی قومی زندگی پر یا ان کی قومی پالیسی پر مترتب نہیں ہو رہا ہے۔

ایمان بالآخرت کی فکری تطہیر ان حالات میں، اور دنیوی فتنوں سے بھرے ہوئے اور خوفِ آخرت سے نا آشنا ماحول میں جن بندگان خدا کو اپنی زندگی کا مقصد یاد آ رہا ہو اور جن کو دین حق سے وابستگی، اس کی اطاعت اور اس کی اقامت کے احساس فرض نے سعی و عمل کی آزمائش گاہ میں لا کھڑا کیا ہو انھیں اپنے اردگرد چھائے ہوئے نفسیات اور ان کے متعدد اثرات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ماحول کی طاقت ایک زبردست طاقت ہوتی ہے، جس کے اثرات سے بچنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا دریا میں رہتے ہوئے تر دامنی سے بچنا۔ یہ ماحول اپنے جراثیم نہ صرف شعوری طور پر ہی بلکہ غیر شعوری طور پر بھی ذہنوں میں داخل کرتا رہتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو انھیں اپنے قلب و دماغ کے مکمل جائزہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور جس طرح کسی حکومت کی پولیس دشمن کے جاسوس کی جامہ تلاشی لیتی اور اس کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر دیکھتی ہے کہ کہیں کسی گوشے میں حکومت کے خلاف کوئی راز تو نہیں موجود ہے، بعینہٖ اسی طرح پوری دیدہ ریزی اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ انھیں اپنے قلب و دماغ کے عمیق ترین گوشوں تک پہنچنا چاہیے اور پہنچ کر دیکھنا چاہیے کہ اس مملکت ایمان میں کہیں نفس اور شیطان کے جاسوس چھپے ہوئے اپنی کارستانیاں تو نہیں کر رہے ہیں؟ یعنی معاملات زندگی کے اندر اپنے عمل و اقدام کا رویہ معین کرنے میں اور خیر و شر کے دوراہے پر کسی ایک راہ کا انتخاب کرنے میں ان کا دل فکر و خوفِ آخرت سے خالی تو نہیں رہتا؟ "سَیُغْفَرُ لَنَا" اور "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ" کی جھوٹی امیدیں کہیں انھیں دنیا پرستی پر تو نہیں

اکساتی ہیں؟ اور پھر یہ کہ وہ جو اقامت دین کا نام لے رہے ہیں اس کی تہ میں کہیں مسلم قومیت کا جذبہ تو نہیں کام کر رہا ہے؟ کوئی شوق انجمن سازی، کوئی آرزوئے ناموری، کوئی ہوس روشناسی، کوئی فریب اقتدار طلبی اس نعرہ کا محرک تو نہیں؟ اسی طرح وہ کہیں اس مقدس فرض عین کو محض اس بنیاد پر تو بجا لانے نہیں چلے ہیں کہ موجودہ عالمگیر معاشی کشاکش اور عمرانی اضطراب اور سیاسی اختلال کے ہنگاموں میں اسلام کا نظام سیاست و معیشت اُن کو ان ساری گتھیوں کا ایک موزوں حل نظر آ رہا ہے؟ اس لیے کہ اس طرح کے محرکات کا رشتہ بھی کچھ گہرائی میں پہنچ کر اسی اصل و مرکز سے جا ملتا ہے جس کو دنیا پرستی کہا جاتا ہے اور ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ دنیا پرستی یعنی دنیوی اغراض و مفاد کی بندگی اور ایمان بالآخرت میں واضح تضاد ہے اور یہ معلوم ہے کہ اقامت حق کی راہ دشوار پر اُس وقت تک ایک قدم بھی نہیں بڑھا جا سکتا جب تک کہ دل دنیا پرستی کے اِن مختلف اشکال و مظاہر سے پاک اور آخرت کی حقیقی جوابدہی کے اندیشوں سے معمور نہ ہو ورنہ ان تمام اغراض سفلی کو یا ان میں سے کسی ایک غرض کو بھی دل میں چھپا کر اقامت دین کی مہم سر کرنے کا خیال باندھنا نہ صرف ضیاع وقت اور موجب تضحیک ہے بلکہ خدا کے دین کو تماشا اور اس کو اپنا آلہ کار بنانا بھی ہے، جو خدا کو اس سے کہیں زیادہ مبغوض ہے جتنا اس فرض کا علانیہ ترک مبغوض ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کی مہم شروع کرنے سے پہلے اپنے قلب و نظر کو اس نوع کے جذبات و محرکات سے پاک کر لیا جائے اور آخرت کی بازپرس کے سوا کوئی محرک باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اس ضرورت کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سعی و جہد مقبول نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر ہم کو وہ طاقت، وہ عزیمت وہ صبر، وہ اطمینان، وہ استقلال، وہ بے خوفی، حصول مقصد کی وہ تڑپ، سعی و اقدام میں وہ سرفروشی، مآل کار سے وہ بے پروائی میسر نہیں ہو سکتی جو اس راہ کا تنہا توشہ اور اس کارزار کا واحد حربہ ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالآخرت ہی وہ تنہا سہارا ہے جو سخت سے سخت حالات میں انسان کی ڈھارس بندھا سکتا اور اس کے قدموں کو اپنی جگہ پر جمائے رکھ سکتا ہے۔ اگر اندر یہ یقین زندہ نہیں اور اگر آخرت کی بازپرس کا دل ہلا دینے والا تصور آنکھوں کے سامنے ایک مجسم حقیقت بن کر موجود نہیں تو اس بات کی ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ انسان اس "منزل ہفت خواں" کو چند قدم بھی طے کر سکے گا۔ اور یقین جانیے

اگر آج نہیں تو کل وہ یہی کہتا ہوا الٹے پاؤں پھر جائے گا کہ "حق تو یہی ہے مگر موجودہ حالات میں اس کی کامیابی ناممکن ہے"۔ چنانچہ یہ جو آج آپ ہر طرف سے ناممکن ناممکن کا شور سن رہے ہیں اس کی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قیامت کی جوابدہی کے احساس پر مُردنی چھا رہی ہے اور لوگوں کو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کی اتنی فکر نہیں جتنی قوم اور ملک اور دنیا کے سامنے کھڑے ہونے کی ہے۔

جہاں تک ہمارا اندازہ کام کرتا ہے بعض لوگ جنھوں نے شعوری طور پر تجدیدِ ایمان کی ہے، دنیا پرستی کے دوسرے فتنوں اور اس کے اشکال و مظاہر سے تو بحمد اللہ دامن کشاں ہو چکے ہیں، مگر ایک فتنہ ایسا ضرور ہے جس کے پھندوں میں ان کے پاؤں شاید ابھی تک الجھے ہوئے ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے اقامتِ دین کو مقصدِ زندگی بنانے کی اصلی محرک محض اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی جاذبیت ہے، اور وہ بھی غالباً اسلام کے ساتھ ایک موروثی عصبیت کی بنا پر۔ آخرت کی بازپرس اگر اس اقدام کی محرک ہے بھی تو محض ثانوی حیثیت سے ہے ــــ خدا کرے ہمارا یہ اندازہ غلط اور یکقلم خلافِ واقعہ ہو، پر قرائن اس کا شبہ ضرور دلاتے ہیں۔ دراصل اس وقت نظمِ مملکت اور معاش کے مسائل نے اتنی ہمہ گیر اہمیت اختیار کر لی ہے کہ آج کا ہر مفکر کسی نظام کا حسن و قبح معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے معاشی مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ یہ اندازِ فکر اتنا مقبولِ عام اور یہ معیارِ انتخاب اتنا آفاق گیر ہو چکا ہے کہ اب کہیں سے اس کے خلاف کسی آواز کا اٹھنا قریباً ناممکن ہے۔ اس عالم میں اس معروفِ عام اور مختارِ کل فکری شاہراہ سے ہٹ کر انسانیت اور انسانی زندگی کے مسائل پر سوچنا دریا کے مخالف رخ پر تیرنے سے کم دشوار نہیں اور جب صورتِ حالات یہ ہے تو اس امکان کو کیونکر ناقابلِ اعتبار سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض خدا کے نام لیوا بھی نادانستہ اس ڈگر پر جا پڑے ہوں۔ پس جہاں ہمیں اپنے محرکِ عمل، یعنی اپنے ایمان بالآخرت کو اغراض و مصالحِ دنیوی کی تمام غلاظتوں سے پاک کرنے کی بالعموم ضرورت ہے وہاں اس لطیف بادۂ ناپاک سے قلب و دماغ کی تطہیر خاص توجہ کی مستحق ہے۔ یہ کام محض اس لیے کرنا چاہیے کہ ہم کو ایک دن اس کی جوابدہی کرنی ہے نہ اس لیے کہ اس کے ہو جانے سے دنیا کا معاشی توازن درست ہو جائے گا، یا اس کی طبقاتی نزاع ختم ہو جائے گی، یا اس کی سیاست کا تشنج دور ہو جائے گا۔ یہ باتیں ان سے تو کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے منکر ہیں تاکہ ان پر

اس کی فطری صداقتیں واضح ہوسکیں اور وہ ایک شاخ کی دلآویزی کو دیکھ کر اس کی اصل کی، اور بحیثیت مجموعی اس پورے شجرۂ طیبہ کی برکتوں کا اندازہ لگاسکیں۔ اگر ان کو، جو شرح صدر کی نعمتوں سے نوازے جاچکے ہیں اور جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اس پستی اور پست نگاہی سے بہت بلند ہونا چاہیے۔ ان کو تو تن من دھن سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اور اس کے دین کی اقامت میں منہمک رہنا چاہیے اور اگر کوئی اس جانفشانی کی وجہ سننی چاہے تو ان کی زبان سے نہیں بلکہ ان کے ایک ایک رونگٹے سے بے ساختہ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا کی چیخ نکل جانی چاہیے۔

عملی تطہیر

ایمان بالآخرت کی اس فکری تطہیر کے بعد دوسرا قدم اس کے عملی جائزہ کی طرف اٹھانا چاہیے جس کا مفصل ذکر ایمان باللہ کے سلسلے میں ہم کر چکے ہیں، یعنی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسی کچھ عملی تاثیر، کتنا رسوخ اور کتنی زندگی ہے؟ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خداپرستانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے؟ وہ ہماری بندگیٔ رب میں شانِ حنیفیت پیدا کرنے کا کس قدر بل بوتا رکھتا ہے؟ اور ہم اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اس عملی جائزہ سے آپ کو یہ حقیقت محسوس ہو کہ کم تر یا بیشتر، ہمارے فکر و عمل کی باگ ڈور خوف آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جایا کرتی ہے — اور کون ہے جو اس سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے — تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روشِ عام سے بچ کر ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا دل میں اعتراف کرلینا ہے اور یقین کرلینا چاہیے کہ جس خوفِ قیامت کے ذکر و بیان سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے، اس کے تذکرا اور تیقن سے ہمارے قلب کو اتنا تعلق نہیں ہے، اور ہمارے اندر جو ایمان بالآخرت ہے اس کی روح فی الواقع ابھی تک غفلت اور پژمردگی کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس احساس و اعتراف کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورت حال کا علاج کیا جائے اور اپنی ساری طاقتوں کو مجتمع کر کے پورے زور کے ساتھ اس دیوِ غفلت کے آہنی پنجوں سے اس مقدس روح کو آزاد کرایا جائے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لیے آپ کو کم و بیش وہی تدبیریں کرنی پڑیں گی جن کا ذکر ہم ایمان باللہ کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔

تحصیل نورِ یقین

سب سے پہلے تو اس ایمان کو محض باپ دادا کی ایک موروثی امانت کے طور پر گلے لگائے

رکھنے کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔ کسی خیال یا نظریہ کو صرف اس بنا پر ماننا کہ ہمارے بزرگ اور ہمارے اسلاف و اکابر اس کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کے پیروؤں اور علم برداروں کی صف میں شمولیت کا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے تو کافی ہے مگر کسی سینہ میں وہ آگ لگانے کے لیے قطعاً ناکافی بلکہ ناکارہ ہے جس کا وہ نظریہ مطالبہ کرتا ہے۔ کسی فکر کی نری تقلید میدان جد و جہد کے غازی اور جانباز سپاہی ہرگز نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس معرکہ کے لیے خیمہ بردار قلی مہیا کر دے۔ سینے میں آگ صرف وہ نظریہ بھڑکا سکتا ہے جو اتباع آبا کے پردے سے نکل کر انسان کی لوح قلب و دماغ پر براہ راست اپنی صداقت کی آتشیں شعاعیں ڈال رہا ہو، اور میدان سعی و جہد کے جانفروش صرف وہ فکر مہیا کر سکتی ہے جو کارخانۂ تقلید سے مستعار نہ لی گئی ہو بلکہ انسان کے اپنے شعور و تعقل میں گہری جڑیں رکھتی ہو۔ انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو اس نے خود محسوس نہ کیا ہو اس کو اس چیز کے برابر کر لے جسے وہ خود محسوس کرتا ہو۔ محسوس کرنے والے کا بیان خواہ کتنا ہی موثر ہو اور سننے والا کتنا ہی متاثر ہونے والا کیوں نہ ہو بہر حال دوسرے کی روایت سے آدمی کبھی اتنا پائیدار اثر نہیں لے سکتا جتنا خود محسوس کرنے کی صورت میں لیا کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر کی زبان سے بھی سوزِ عشق اور دردِ فراق کے مضامین سن کر آدمی کے دل میں وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی جو خود عشق کی آگ میں جلنے اور ہجر کے انگاروں پر لوٹنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ پس جب تک آدمی کا ایمان محض اس بنیاد پر قائم رہے گا کہ اس کے باپ دادا ان چیزوں کو مانتے تھے، اس میں نہ تو صحیح کیفیات ایمانی پائی جا سکیں گی اور نہ وہ ایمان کے تقاضے ہی پورے کر سکے گا۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ایمان محض تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی یقین و اذعان پر مبنی ہو۔

یہ نورِ یقین حاصل کیسے ہو؟ اس کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور وہ ہے قرآن کا غائر مطالعہ اور پھر اس کی رہنمائی میں آفاق و انفس کی آیات پر تفکر۔ رہا فلسفۂ یونان و عجم تو وہ اس ایمان کے حصول میں تو کچھ بھی مدد نہیں دے سکتا، البتہ اس سے دور پھینک دینے میں بہت کچھ کارگر ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ بھی ہماری تاریخ دینی کا ایک سخت المناک باب ہے کہ لوگوں نے عقائد و نظریات تو قرآن سے لے لیے مگر ان کی صداقتوں پر دلائل مہیا کرنے کے لیے وہ

یونانی تفلسف کے اس بیابان میں جادو ٹے جہاں شک و ریب اور تذبذب و وساوس کی خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ جانے انھیں کس چیز نے اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے روک دیا کہ جس قرآن نے بنی نوع انسان کو ان عقائد و نظریات کی تعلیم دی ہے وہ خود ہی ان کے دلائل بھی پیش کرتا ہے اور اس کے دلائل ایسے ہیں جو عین فطرت کی صدا ہیں اور ان عقائد کے باب میں دماغ کو تسلیم، قلب کو طمانیت اور روح کو یقین بخش سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اب اس غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے اور قرآنی عقائد کی صحت کا یقین حاصل کرنے کے لیے فلسفۂ مغرب کی طرف رجوع کرنے کے بجائے ان فطری اور دلنشین دلائل سے مدد لی جائے جو خود قرآن نے پیش کیے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ایک دوسری غلط فہمی سنگ راہ بنی ہوئی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دلائل تو ان کے سنانے کے ہیں جو قیامت کے منکر ہیں، چنانچہ ان کے بیان کے وقت قرآن انھیں کو مخاطب بھی کرتا ہے۔ ہم کو جو پہلے ہی سے قیامت کا اقرار کیے بیٹھے ہیں، ان دلائل سے کیا لینا ہے؟[1] افسوس ہے کہ یمن و سعادت کے کتنے ہی خزانے ہیں جنھیں جہل کے اس "نورانی حجاب" نے ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ اور مزید افسوس اس چیز کا ہے کہ یہ بات اسی قرآن کو پڑھتے ہوئے فرمائی جاتی ہے جو علانیہ کہہ چکا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، اور شب
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ	و روز کے بعد دیگرے آمد و رفت میں عقل والوں کے لیے
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	بڑی نشانیاں ہیں۔

معلوم ہے کہ یہ عقل والے کون لوگ ہیں جن کے لیے (یعنی جن کی عبرت پذیری اور یقین یابی کے لیے

[1] یہی تصور ہے جس نے قرآن کی تعلیم کو ہمارے دینی دار العلوموں میں وہ حیثیت دلائی ہے جو صد بارس کی مردہ منطق و فلسفہ کی تعلیم سے بھی کہیں فروتر ہے۔ وہ فلسفہ جو ابھی تک زمین کو کسی قطب کی طرح ساکن ٹھہرائے ہوئے ہے اور جو ابھی تک یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی شے بیک وقت دو نوع کی حرکتیں بھی کر سکتی ہے، تعلیم قرآن کے بارے میں کھلم کھلا یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس پر تو محض تبرک کے لیے نظر ڈال دی جاتی ہے ورنہ ائمہ نے اس کے تمام احکام نکال کر فقہ کی کتابوں میں مدون کر دیے ہیں۔ گویا فقہی احکام کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے نہیں ہے بلکہ تیرہ صدیاں پیشتر بسنے والے کفار عرب اور منافقین مدینہ اور اہل کتاب ہی کے سننے سنانے کے لیے تھا۔

کائنات کی خلقت اور اس کے نظم ونسق میں بے شمار نشانیاں بتلائی گئی ہیں؟ یہ کوئی فلاسفہ یا علمائے طبعیات وفلکیات کا گروہ نہیں ہے، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لا چکے ہیں اور باعتبار اعمال صالحہ خدا پرستی کی معراج کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قرآن اپنے اس لفظ کی تفسیر خود ہی آگے چل کر اس طرح کرتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

(یعنی عقل والے وہ ہیں) جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور وفکر کیا کرتے ہیں۔

یہ الفاظ جہاں اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ کائنات کے اس وسیع وعریض کارخانہ میں امرِ حق کی طرف رہنمائی کرنے والی نشانیاں صرف ان کے لیے ہیں جو خدا کے سچے پرستار ہیں، وہاں اس معاملے کے دوسرے پہلو کو بھی بالکل روشن کیے دیتے ہیں کہ زمین وآسمان کی آفرینش میں غور وتدبر کرتے رہنا ان بندگانِ حق کا ایک مستقل وصف ہے۔ یہ نہ گمان کرو کہ کہیں اتفاق سے اگر ان کی نگاہ آفاق وانفس کے ان حقائق کی طرف مڑ گئی تو وہ ان میں کوئی نشانی پا لیتے ہیں۔ نہیں، جس طرح ذکرِ الٰہی ان کا وظیفۂ حیات ہے اسی طرح "تفکر فی الخلق" بھی ان کا ایک نشانِ امتیاز ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس تفکر سے وہ حاصل کیا کرتے ہیں اور اس کارخانۂ عالم کی ساخت وپرداخت میں انھیں کس چیز کی نشانیاں نظر آتی ہیں؟ تو اس کا جواب بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیے، جو فوراً ہی بعد فرماتا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(آل عمران – ۲۰)

(آسمان وزمین کی خلقت میں غور کر کے یہ لوگ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں) پروردگار! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا ہے پس ہمیں آگ کی سزا سے بچا۔

اسی طرح سورہ مرسلات کی ابتدائی آیات کو پڑھیے، جہاں ہواؤں کے مختلف حالات اور ان کے گوناگوں اثرات کو یوم جزا کی آمد پر بطور قسم (شہادت) پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

.... فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۔ عُذْرًا

پھر (جو اپنی تصریف کے ذریعہ) لوگوں کو یاد دہانی کرتی ہیں

اَوْ نُذْرًا ۔ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ

تاکہ (غافلوں کے خلاف) معذرت (اور حجت) ہو اور (خدا ترسوں کے لیے) ڈراوے کا کام دے۔ (ہواؤں کے یہ مختلف حالات اور اثرات شاہد ہیں کہ) جس چیز کی تمھیں دھمکی دی جارہی ہے وہ بالیقین وقوع میں آکر رہے گی۔

سورہ ہود کے اندر نافرمانیِ رب کی پاداش میں ہلاک ہوجانے والی چند بستیوں اور قوموں کی سرگزشت سنانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ

یقیناً اس (داستانِ اقوامِ بائدہ) کے اندر اس شخص کے لیے بڑی زبردست نشانی ہے جو آخرت کی سزا کا خوف کرے۔

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے قرآنی بیانات بالکل غیر مشتبہ طور پر اس حقیقت کی تصریح کرتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ دلائل آفاق و انفس جس طرح منکرینِ اسلام سے خطاب کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح ان کا روئے سخن خود پیروانِ قرآن کی طرف بھی ہے، بلکہ جہاں تک عملاً ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے، وہ تو صرف انھی کے لیے ہے۔ اس لیے کہ گو سورج سب کے لیے نکلتا ہے، پر حقیقت میں اس کا نکلنا صرف انھی کے لیے ہوتا ہے جو آنکھیں رکھتے ہوں۔ اب اگر کوئی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی ان پر پٹی باندھ لے تو ظاہر ہے کہ اس کے حق میں بھی آفتاب کا وجود عدم کے برابر ہی رہے گا۔ قرآن کی جو آیات توحید اور معاد کے دلائل پر مشتمل ہیں، ان میں مسلمانوں کے لیے ایمان کی زیادتی، یقین کی تجلی اور بصیرت کی روشنی کا غیر محدود مواد ودیعت کردیا گیا تھا مگر انھوں نے کہا کہ "ان آیات کا تعلق کفار و منکرین سے تھا، فلاں فلاں آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، اور قرآن کا اتنا حصہ مشرکوں کو سامنے رکھتا ہے، اس لیے ان آیتوں اور قرآن کے ان حصوں میں ہمارے لیے برکتِ تلاوت کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ یہ کہنے اور جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ کی یہ ذہنی کارروائی انجام دے لینے کے بعد ناممکن تھا کہ وہ ان آیات سے وہ فائدہ حاصل کرتے جو ان سے مطلوب تھا۔ دراصل اس باب میں وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصبِ رسالت کے فہم و ادراک سے عاجز یا غافل ہو بیٹھے۔ انھیں یاد نہیں رہا کہ رسول اللہ کی بعثت کا مقصد صرف احکام و قوانین الٰہی کی تبلیغ ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران ۔ ۱۶۴)	یہ اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان ایک ایسا رسول برپا کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگیاں سنوارتا ہے، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

موضوع بحث کی مناسبت سے یہاں صرف دو باتیں سامنے رکھ لینی کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کلام کا رخ اہل ایمان کی طرف ہے۔ دوسری یہ کہ مقاصد بعثت میں سے ایک اور پہلا مقصد یہ ہے کہ "رسول مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے"۔ آیات کی تلاوت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی قرأت کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے بیان کردہ دلائل و شواہد سے ان کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط اور اس کے کیف و اثر کو تیز کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی اٹھ جاتا ہے کہ قرآن کی وہ آیات، جن میں توحید و معاد کے آفاقی و نفسی دلائل مذکور ہیں، ہر صاحب ایمان کے قوائے فکر و تدبر کو براہ راست خطاب کرتی ہیں۔ پس ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس خطاب کا ٹھیک ٹھیک خیر مقدم کرے اور ان پاک صداؤں کو عقل کے کانوں سے سنے جو ان آیات کے اندر سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا نور یقین لیے ہوئے نکلتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قیامت کی آمد غیب محض کے واقعات میں سے ہے اور کوئی انسان اس کو ایک شاہد حقیقت کی حیثیت سے نہیں پا سکتا۔ مگر قرآن ہم کو یقین دلاتا ہے کہ جزا و سزا اور یوم آخرت کے چہرے پر جو نقاب ہے وہ اتنی موٹی نہیں ہے کہ فہم و بصیرت کی نگاہوں کے لیے اس کی جھلکیوں کی گرفت ناممکن ہو، بلکہ یہ نقاب صرف اسی حد تک ادراک نظر سے مانع ہے جس حد تک کہ ایک حاملہ کا گوشت پوست حمل کے وجود کو عام نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي	یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا جہاز کہاں لنگر انداز ہوگا۔ کہہ دو اس کا علم تو محض میرے رب کو ہے، اپنے وقت پر اس کو وہی بے نقاب کرے گا۔ لیکن اتنا تو ہر حساس فرد

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (الاعراف - ۱۸۷)

اپنی نگاہ فکر و تدبر سے دیکھ سکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے شکم کے اندر وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح ہو رہی ہے۔ وہ جب آئے گی بالکل اچانک نمودار ہو گی۔

یعنی جس طرح ایک نو مہینے کی حاملہ اپنی ہیئت کذائی میں خود اپنے حمل کا خاموش اعلان کرتی ہے اور اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے بچے کو منظر عام پر لے آنے کے لیے بس ایک حکم کی منتظر ہوتی ہے، بعینہٖ ایسا ہی حال اس کائنات کے بطن میں قیامت کا بھی ہے کہ وہ اس کے "شکم" میں ایک "تام الحمل" کی طرح موجود ہے، اس کے بوجھ سے یہ "شکم" پوری طرح گرانبار ہے اور اسے نکال کر سامنے رکھ دینے کے لیے بس ایک حکم کی راہ تک رہا ہے۔ شکم کائنات میں اس حمل کی گرانباری اتنی نمایاں ہے کہ جس کی چشم خرد میں کچھ بھی بینائی ہو گی وہ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غرض ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ ایمانیات کے باب میں کبھی اس حد پر جا کر نہ ٹھہر جائے کہ "میں خدا اور یوم جزا پر ایمان رکھنے والوں میں شامل ہو چکا ہوں، اب مجھے ان کے رموز و نکات اور ان کے دلائل و شواہد کی تحقیق و جستجو میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی ضرورت نہیں"۔ یہ ایک شدید تباہ کن غلط اندیشی ہے۔ اس کے برعکس اس کو ہر وقت غور و فکر میں لگا رہنا چاہیے اور قرآن کی ایمان افروز آیات میں تدبر کرتے ہوئے اپنے اس علم اور نظریہ کو کہ "قیامت آئے گی اور ایک روز جزا برپا ہو گا" یقین کی حد تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

استحضار فکر آخرت اس کے بعد دوسری چیز جو ایک مومن کے لیے ضروری ہے یہ ہے کہ آخرت کا یہ علم و یقین اس کے دماغ کی حدود سے نکل کر اس کی روح کے نہاں خانوں میں سرایت کر جائے اور اس کے حافظے کے اطراف و جوانب پر پوری طرح چھا جائے۔ اس کو خدائے قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کا خیال حتی الامکان کبھی بھولنے نہ پائے۔ وہ کہیں بھی ہو، کسی حال میں بھی ہو، اس بڑے دن کے ہولناک محاسبے سے غافل اور بے فکر نہ ہو۔ آخرت کا یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا اندیشہ ہی دراصل نیک روی اور صلاح عمل کی جان ہے، اور اسی بنا پر میزان الٰہی میں اس کا جو وزن ہے وہ ہمارے وہم و خیال سے باہر ہے۔

قدرتی طور پر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور ایک خدا ترس انسان کی نگاہ پوری تجسس کے ساتھ معلوم کرنا چاہے گی کہ وہ کیا ذرائع اور تدابیر ہیں جن کو اختیار کرکے اس سرچشمۂ تقویٰ اور اس کلید بندگی کو حاصل کیا جا سکتا ہے؟ سو اگر ہمارے اندر حق طلبی کا سچا جذبہ موجود ہو تو ہم کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس مہتم بالشان معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ارشادات نبوی پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آنحضرت صلعم نے موت کو، جو قیامت کا مقدمہ اور حیات اخروی کا دیباچہ ہے اور جس کو یاد رکھنا دراصل یوم آخرت ہی کو یاد رکھنا ہے، برابر اپنے چشم تصور کے سامنے رکھنے کے کتنے فضائل بیان کیے ہیں اور صحابہ کو اس کی کتنی تاکید فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت (ترمذی۔ نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُس چیز کو بکثرت یاد کرتے رہو جو دنیوی لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے، یعنی موت کو۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے اپنے اصحابؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

استحیوا من اللہ حق الحیاء ..... من استحیی من اللہ حق الحیاء ...... ولیذکر الموت والبلیٰ (ترمذی۔ احمد)

اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے ..... جو شخص اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنا چاہے اس کو لازم ہے کہ ..... موت اور اس کی آزمائشوں کو یاد کرے۔

بخاری کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کا شانہ پکڑ کر پورے اہتمام سے انہیں سکھایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل

دنیا میں ایک اجنبی بلکہ ایک راہرو کی طرح رہو جس کی کوئی شے تم کو تمہارے "اصلی وطن" یعنی اس دوسرے عالم سے غافل کر سکے۔

نہ صرف یہ بلکہ موت، قیامت، آخرت اور جزا و سزا کے خیالات کا استحضار اہل ایمان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے شارع نے اپنی کوئی امکانی تدبیر اٹھا نہیں رکھی اور اس کی خاطر بعض ایسے افعال کا بھی حکم دیا جو فی نفسہٖ خام کار لوگوں کے مبتلائے فتنہ ہو جانے کے امکانات سے خالی نہ تھے، چنانچہ قبروں کی زیارت کی ممانعت کرنے کے کچھ دنوں بعد اس کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید بھی فرمائی گئی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا — میں نے تمھیں قبروں کے پاس جانے سے روک دیا تھا، مگر اب تم جایا کرو۔

زیارت قبور کی یہ ممانعت کیوں ہوئی تھی؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ابتدا میں لوگ توحید کے جامع اور تفصیلی تصور کو ہضم نہیں کر سکتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے مشرکانہ آداب و رسوم سے، جن کے وہ برسوں عادی رہ چکے تھے، ان کے دل و دماغ پوری طرح مانجھ کر قابل اطمینان حد تک مجلّٰی نہیں کیے جا سکے تھے۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ کہیں اپنے بزرگوں کی قبروں پر جا کر ناواقفیت کی حالت میں اضطراری طور پر کچھ ایسی حرکتیں نہ کر بیٹھیں جو لوازم توحید کے منافی ہوں، جیسا کہ بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ چونکہ مصر میں رہ کر قبطیوں کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے وہ مانوس ہو گئے تھے اس لیے حضرت موسیٰ کے ہمراہ سفر کرتے وقت جب ان کا گذر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جس نے اپنے معبدوں میں بے شمار مورتیوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا رکھا تھا تو اپنے اسی ہادی و سردار سے، جو ان کو اول روز سے ایک بن دیکھے خدا کی پرستش کا درس دے رہا تھا، بے تابانہ اور بے باکانہ اس خواہش کا اظہار کر بیٹھے کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (اے موسیٰ! جس طرح ان کے بہت سے معبود ہیں ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دے)۔ پس شرک زدہ ذہنیتوں کا یہی خطرہ تھا جس کے پیش نظر ہادی اعظم نے اس وقت تک قبروں پر جانے سے بھی عام مسلمانوں کو روک رکھا جب تک کہ ان کے اندر توحید کی پوری روح اپنے تمام لوازم و مقتضیات کے ساتھ اتر نہیں گئی۔ پھر جب یہ ہو چکا تو آپ نے اپنی گذشتہ ممانعت کو واپس لیتے ہوئے اس کی اجازت دے دی، اور نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اس کی تاکید بھی کر دی۔ اس اجازت اور تاکید کی غایت اور ضرورت کیا تھی جس کے عظیم تر فوائد کی خاطر اس زیارت قبور کا حکم دیا گیا جو بہر حال بالفعل نہ سہی، بالقوہ کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مشرکانہ وساوس کو ابھارنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے؟ اس کا جواب بھی خود اسی پاک زبان سے سنیے جس نے یہ حکم دیا ہے:

عن ابن مسعودؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الاٰخرۃ (ابن ماجہ)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، مگر اب تم ان کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔

مسلم کی ایک حدیث میں زیارتِ قبور کی یہی غرض و غایت ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

..... فزوروا القبور فانھا تذکر الموت

...... سو قبروں کے پاس جایا کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

پس فکرِ آخرت کو ہر دم تازہ رکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اپنی موت کو کثرت سے یاد کرتا رہے اور اس طرح فکرِ آخرت کے ساتھ اپنے تعلق کو پائدار کرتا ہوا اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے جس کی نشاندہی حضرت ابن عمرؓ کی اس زریں نصیحت میں موجود ہے:

اذا امسیت فلا تنتظر الصباح واذا اصبحت فلا تنتظر المساء (بخاری)

جب شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔

پھر موت اور آخرت کی اس یاد کو با اثر کرنے کی خاطر اس شہرِ خموشاں کی سیر بھی کرتے رہنا چاہیے جہاں ہمارے ہی جیسے انسانوں کی بستی ہے مگر جو اب عمل کے میدان سے نکال کر اپنے رب کے حضور بے چارگی کے عالم میں لا کھڑے کیے گئے ہیں۔ یقیناً اس منظر کے اندر ایک نگاہِ عبرت پذیر اور ایک دلِ حق آشنا کے لیے بہت کچھ سامانِ فکرِ آخرت موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان تریاق کو اپنے حق میں خود زہر بنا لے اور قبروں کو سامانِ فکرِ آخرت بنانے کی بجائے خدائی طاقتوں کا یا روحانی فیوض کا ایک "سب اسٹیشن" بنا کر انہی کو پوجنا یا ان پر مراقبے اور اعتکاف کرنا شروع کر دے۔

دوسری چیز جو اس فکرِ آخرت میں زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا موثر ذریعہ بنتی ہے وہ سارے قرآن کی بالعموم اور ان آیات کی بالخصوص، جن میں قیامت کے پرہول کوائف و مناظر بیان کیے گئے ہیں حضورِ قلب کے ساتھ تلاوت ہے۔ چنانچہ قرآن مومنوں کی صفت ہی یہی بتاتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا۔ (الانفال۔ ۱)

سچے مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان کو اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

پھر اس تلاوت کا بھی اعلیٰ و افضل طریقہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کو نماز کے اندر پڑھا جائے، جیسے کہ انسان

اپنی کامل شان عبدیت میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کو انتہائی قربت حاصل ہوتی ہے۔ نماز کے اندر پڑھنے سے آیات قرآنی کا اثر دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ مگر اب تو صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ نماز کے لیے ان سورتوں کا انتخاب مشکل ہی سے کیا جاتا ہے جو ایک سانس میں ختم نہ ہو سکیں، اور اس پر مزید ستم یہ کہ جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے اس کے مفہوم و مطالب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی روشن ہدایتیں، اور اس کی پہاڑوں تک کو تھرتھرا دینے والی قوتیں ہمارے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں جس پیمانہ سے ہم نے ان کو ناپا، کیا وجہ ہے کہ اسی پیمانہ سے وہ ہم کو نہ ناپیں!

ہم ایمان بالآخرت کی اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس حقیقت کی طرف پھر توجہ دلائیں گے کہ اللہ کے دین کی اقامت کا نام لینے سے پہلے ہمیں تمام دوسرے محرکات سے اپنے دلوں کو پاک کر کے صرف آخرت کی بازپرس کے احساس کو سامنے رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ ایمان بالآخرت میں سے تقلیدی جمود نکال کر اس کے اندر ذاتی معرفت اور بصیرت کی بیدار روح پیدا کرنی چاہیے۔ یقیناً وہ بھی مسلمان ہی تھے جو ہوا کے تیز و تند جھکڑوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ بس وہ یوم موعود آگیا جب یہ دنیا تباہ کر کے ایک دوسرا عالم بنایا جائے گا اور ہمیں اپنی کمائی میں سے ایک ایک پائی کا حساب دینا پڑے گا۔ اور یہ گمان ایک مجسم خوف بن کر ان کے ذہنوں کو اس طرح گھیر دیتا تھا کہ وہ پناہ ڈھونڈھنے کے لیے مسجد نبوی کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک ہم بھی مسلمان ہیں جن کے سکون خاطر میں آج کا بڑے سے بڑا قہر خداوندی کوئی ہلکا سا تلاطم بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہی قرآن ہے جس کی ایک آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا جب قیامت کے مناظر کا ایک پرتو دکھاتی ہے تو وہ آنکھیں جن کی طرف جہنم کی چشم و ہم بھی اٹھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی، ابل پڑتی ہیں اور رات کا بڑا حصہ اسی رکعت کے قیام میں ختم ہو جاتا ہے اور زبان پر اضطراب اسی ایک آیت کو برابر دہراتی چلی جاتی ہے اور آخرت کی بازپرس کے احساس کی شدت ہے کہ نہ آنکھوں کو اشک باری سے رکنے دیتی ہے نہ زبان کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور آج وہی قرآن ہے جس کی رعد و برق کی سی دھمکیاں نہ ہماری آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک نکلوا سکتی ہیں اور نہ ہی تلاوت کے وقت ہماری زبانوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں۔ یاد رہے یہ ایک نا دیدہ قلب حال ہے، اس کے ساتھ دین حق کی نہ اطاعت ہو سکتی نہ اقامت، دین کی اطاعت و اقامت کے لیے ضروری ہے کہ اس قلب حال کا بھی قلب حال کیا جائے۔

(باقی)